27

تیاری کا وقت ختم ہو رہا ہے اور کام کا وقت نزدیک آ گیا ہے

(فرمودہ 28 اگست 1942ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

"مَیں کمر درد کی وجہ سے زیادہ دیر کھڑا نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ مَیں کئی دن قادیان سے باہر رہا اور دو جمعوں کے خطبے یہاں نہیں بیان کر سکا اس لئے مَیں نے مناسب سمجھا کہ اس تکلیف کے باوجود جمعہ خود ہی پڑھاؤں۔

مَیں نے پالم پور جانے سے پہلے ایک خطبہ پڑھا تھا جس میں مَیں نے جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ آئندہ بہت بڑے فتن کا دروازہ ہندوستان میں کھلنے والا ہے اور بوجہ ہندوستانی ہونے کے ہمیں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ فیصلہ کرنا ہو گا اور چونکہ یہ معاملہ ایسا اہم ہے کہ اس کا اثر ہماری جانوں، ہمارے مالوں، ہماری عزتوں بلکہ ہمارے وطن پر بھی پڑ سکتا ہے اور پڑنے والا ہے اس لئے مَیں نے جماعت کے دوستوں سے خواہش کی تھی کہ وہ دعائیں کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسے فیصلہ پر پہنچنے کی توفیق دے جس پر چل کر ہم کامیاب ہو سکیں اور مشکلات سے محفوظ رہیں یا ہمیں کم سے کم مشکلات کا سامنا ہو۔ چنانچہ دعاؤں اور غور کرنے کے بعد مَیں نے اپنے فیصلہ کا اعلان پالم پور سے ہی لکھ کر بھجوا دیا تھا جو "الفضل" 18 اگست 1942ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس عرصہ میں جماعتوں کی طرف سے میں یہ تو نہیں کہتا کہ ساری جماعتوں کی طرف سے بلکہ کچھ جماعتوں کی طرف سے میرے پاس ریزولیوشن آئے ہیں جن میں انہوں نے اپنی طرف سے قربانیاں پیش کرنے کا اقرار کیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر آواز پر لبیک کہتی ہوئی اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں اور انہیں جو بھی حکم دیا

جائے گا اس کی وہ پوری طرح تعمیل کریں گی۔ مَیں سمجھتا ہوں جن جماعتوں نے ریزولیوشنوں کی صورت میں ایسے اقرار نہیں کئے وہ بھی جس حد تک دوسروں نے اقرار کئے ہیں ان اقراروں میں شامل ہیں۔ ان کا ایسے جلسے کر کے ریزولیوشن پاس نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے سمجھا اس قسم کے ریزولیوشنوں کی ضرورت ہی نہیں جبکہ وہ بیعت کر چکے اور احمدیت میں شامل ہو چکے ہیں مگر میرے نزدیک ان اقرار کرنے والوں کے سامنے بھی پورے طور پر اُن قربانیوں کا نقشہ نہیں آیا جن کو مَیں نے اپنے اعلان میں مدنظر رکھا ہے۔ اس لئے مَیں ابھی تک نہیں کہہ سکتا کہ ان اقراروں کی قیمت کیا ہے۔ بسا اوقات انسان ایک چیز کو چھوٹی سمجھتا ہے اور اسے کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات انسان ایک وقتی قربانی کے لئے تیار ہو جاتا اور اسے دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن ایک لمبی اور بظاہر نسبتاً چھوٹی قربانی کرنی اس کے لئے بہت مشکل ہوتی ہے مثلاً تحریک جدید ہی ہے۔ مَیں ہمیشہ خیال کیا کرتا ہوں کہ اگر جان دینے کا سوال ہوتا تو صرف پانچ ہزار مرد و عورت اپنے آپ کو پیش نہ کرتے جیسے تحریکِ جدید میں قریباً اتنے ہی لوگوں نے حصہ لیا ہے بلکہ پندرہ، بیس، تیس بلکہ چالیس ہزار آدمی اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتے مگر یہ قربانی چونکہ لمبی اور متواتر دس سال کے لئے تھی اس لئے بہت سے ایسے لوگ جو ہمیشہ اپنی جان اور مال قربان کرنے کے دعوے کرتے رہتے تھے، پیچھے رہ گئے اور جو شامل ہوئے ان میں سے بھی ایک معتدبہ حصہ ایسا ہے جس نے قانون سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو تحریکِ جدید میں شامل کر لیا ہے ورنہ درحقیقت وہ شامل نہیں کیونکہ ان کی آمدنیوں کے مقابلہ میں ان کی قربانیاں بہت ہی حقیر اور معمولی ہیں۔ بے شک انسانی قانون کو انہوں نے پورا کر دیا ہے لیکن خدائی قانون کے ماتحت انہوں نے آنے کی کوشش نہیں کی۔

پس یہ ایک بہت بڑا فرق ہے جو ہمیں قربانی کے میدان میں دکھائی دیتا ہے کہ بہت سے لوگ وقتی قربانی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ انسان سمجھتا ہے مَیں نے ایک دفعہ قربانی کی تو معاملہ ختم ہو جائے گا چنانچہ لاکھوں نہیں کروڑوں لوگ اس غرض کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ ان کی گردنوں پر خنجر پھیر دیا جائے لیکن اگر انہی کو قید خانوں میں ڈال کر

ان سے لمبی قربانیاں لی جائیں، لوہے کی چٹکیوں سے ان کے گوشت نوچے جائیں ، ان کی آنکھیں نکال لی جائیں اور ان کے ناک اور کان کاٹ لئے جائیں تو گو وہ مریں گے نہیں مگر ان میں سے بہت سے لوگ جو جان دینے کے لئے تیار تھے ، واویلا کرنے لگ جائیں گے اور معافی کے خواستگار ہو جائیں گے کیونکہ چھوٹی اور لمبی قربانی وقتی قربانی سے زیادہ ہیبت ناک اور خطرناک ہوتی ہے۔ پس مَیں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں نے قربانی کے وعدے کئے ہیں ان میں سے کتنے اس وعدے پر قائم رہ سکتے ہیں۔ مَیں ان سب کو دیانتدار سمجھتا ہوں اور مَیں یقین رکھتا ہوں کہ انہوں نے یہ وعدے سچائی کے ساتھ کئے ہیں مگر پھر بھی مَیں نہیں کہہ سکتا کہ وقت پر کتنے لوگ ہوں گے جو واقع میں قربانی کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ شاید تم میں سے بہت سے ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے موجودہ واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ خیال کر لیا ہو گا کہ جو فتنہ اٹھا تھا وہ اب دب چکا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ فتنہ دبا نہیں اور دب نہیں سکتا۔ ہندوستان کی آزادی کا سوال اتنے لمبے عرصہ سے دنیا کے سامنے آ رہا ہے۔ اتنی مشکلوں اور اتنی صورتوں میں لوگوں کے سامنے آ رہا ہے اور اس طرح متواتر لوگوں کے دماغوں میں اس سوال نے چکر لگایا ہے اور پھر اس قدر لمبے عرصہ سے ہندوستان اور انگلستان کے لوگوں میں اس مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے کہ اب ان خیالات کو دلوں سے نکال دینا بالکل ناممکن ہے۔ اسی طرح ہندو مسلم سوال پر سالہاسال سے بحث ہو رہی ہے اور یہ سوال بھی مختلف شکلوں میں لوگوں کے سامنے آتا رہا ہے۔ مختلف صورتوں میں لوگوں کے سامنے آتا رہا ہے اور مختلف پیرایوں میں لوگوں کے سامنے آتا رہا ہے۔ اس لئے اب لوگوں کے دلوں سے ان خیالات کا نکال دینا بالکل ناممکن امر ہے۔ پس یہ خیال کر لینا کہ کسی سختی سے یا گرفتاری سے یا سزاؤں کے خوف سے سیاسی ہندوستانیوں کے دلوں سے یہ احساس مٹ جائے گا کہ ہندوستان کو آزاد ہونا چاہئے یہ ایک طفلانہ حرکت اور بچوں کا سا خیال ہے۔ جو آگ لگ چکی ہے یہ اب بجھ نہیں سکتی، جو فتنہ اٹھ چکا ہے یہ اب دب نہیں سکتا۔ اس آگ کو بجھایا جا سکتا تھا، اس فتنہ کو مٹایا جا سکتا تھا مگر آج سے کئی سال پہلے۔ اس وقت انگریزوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ہندوستانیوں کو معمولی معمولی حقوق دے کر مطمئن کر دیں گے حالانکہ اس وقت اگر وہ صحیح طریق اختیار کرتے اور

اس راستہ پر چلتے جو مَیں نے بتایا تھا تو آج انہیں یہ مشکلات پیش نہ آتیں۔

آج سے پچیس سال پہلے 1917ء میں جب ہندوستان میں سیاسی حقوق کے متعلق پکار پیدا ہوئی اور مسٹر مانٹیگو وزیر ہند ہندوستان میں آئے تو اس وقت مَیں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ سیاسی اصول کے پیچھے پڑنے کی بجائے آپ عام لوگوں کے اضطراب اور بے چینی کی اصل وجوہ معلوم کریں اور مَیں نے انہیں بتایا کہ منجملہ اَور وجوہ کے اصل سوال ہندوستانیوں کی روٹی کا ہے۔ عام لوگوں کو اس امر سے کوئی تعلق نہیں کہ کونسلوں کی کیا شکل ہو اور ہندوستانیوں کو اس وقت کیا اختیارات ملنے چاہئیں بلکہ ان کے سامنے سب سے اہم سوال اپنی روٹی کا ہے۔ اس لئے بجائے کونسلیں بنانے کے بعض بڑے بڑے عہدے ہندوستانیوں کے سپرد کر دیئے جائیں اور جلد سے جلد سول سروس کو خالص ہندوستانی بنا دیا جائے۔ اس طرح جوں جوں یہ عہدے ان کے سپرد ہوتے جائیں گے، وہ آئندہ حکومت کے لئے تیار ہوتے چلے جائیں گے اور حکومت سنبھالنے کے وہ اہل ہو جائیں گے۔ اس کے برخلاف کونسلوں میں بے اختیار اور صرف بحث مباحثہ کے عادی ہندوستانی حکومت کی قابلیت کبھی پیدا نہ کریں گے اور صرف حکومت کے پہلو میں ایک کانٹا ثابت ہوں گے اور ایسے مشکل وقت میں جبکہ ہندوستانیوں کی روٹی کا سوال ہی حل نہیں ہوا، وہ نہ تو صحیح مشورہ دے سکیں گے اور نہ صحیح مشوروں کے مطابق عمل کر سکیں گے۔ مگر وہ اس وقت اسی شوق میں رہے کہ کچھ حقوق ہندوستانیوں کو کونسلوں میں دے دیئے جائیں اور بنیاد کی بجائے اوپر کے چوبارے تیار ہو جانے چاہئیں۔ اس تجویز کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانیوں کی زبان تو کھول دی گئی مگر ان کے دماغ کی تربیت کے لئے کوئی سامان نہ پیدا کیا گیا حالانکہ اگر اس وقت زیادہ تر عہدے ہندوستانیوں کے سپرد کر دیئے جاتے تو آہستہ آہستہ تمام عہدوں پر ہندوستانی قابض ہو جاتے اور ان کے دلوں میں انگریزوں کے متعلق کینہ اور بغض پیدا نہ ہوتا۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ ہر نئے تغیر پر ہندوستانی یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم لڑے، ہم نے مارا اور ہم نے انگریزوں سے اپنا فلاں فلاں حق چھین لیا۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ ہم بالغ ہوئے اور ہمارے سیاسی والدین نے ہمارا حصہ ہم کو دے دیا بلکہ ان کا ذہن صرف اس طرف جاتا ہے کہ ہم انگریزوں سے لڑے، ہم نے انہیں مارا اور ان سے اپنے فلاں فلاں

حقوق چھین لئے اور آئندہ بھی ہم لڑیں گے، ماریں گے اور اپنے حقوق چھینیں گے۔ اس ذہنیت کو بھلا کون مٹا سکتا ہے۔ پھر ایک اَور خطرناک غلطی گورنمنٹ سے یہ ہوئی کہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے بعد جب نئی قسم کی گورنمنٹ کی بنیاد رکھی گئی تو اس وقت بھی اس نے بخل سے کام لیا اور اگلا قدم اٹھانے میں دیر کی گئی اور اس طرح جو تجربہ اس نے شروع کیا تھا اسے بھی تکمیل تک پہنچنے نہ دیا۔ میرے لئے ہمیشہ ہی یہ بات حیرت کا موجب رہی ہے کہ غالباً 1921ء میں اسمبلیوں کے لئے الیکشن ہوئے تھے مگر اس کے بعد نئی کونسلوں کے کھڑا ہونے تک اکثر کونسلوں کے دوبارہ الیکشن نہیں ہوئے۔ اب تو کہا جاتا ہے کہ جنگ کی وجہ سے نئے انتخابات نہیں کئے جاسکتے مگر مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم کے بعد بھی بعض کونسلیں دس دس سال تک قائم رہی تھیں۔ اس سے قدرتی طور پر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ حکومت ہمیں حقوق دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہم چونکہ مذہبی آدمی ہیں اس لئے ہم لوگوں کے خیالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے یا اگر اندازہ لگا سکتے ہیں تو کسی مذہبی مثال سے ہی۔ لیکن جو لوگ سیاسی ہیں اور جن کی زندگی کا مقصد ہی حکومت کا حصول ہے۔ تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ ان کے لئے یہ بات کتنی تکلیف دِہ تھی کہ جب وہ سمجھتے تھے کہ انہیں جلد سے جلد حقوق ملنے والے ہیں، حکومت نے اپنے وعدوں کو پورا نہ کیا اور ہندوستانیوں کو حقوق دینے میں تاخیر سے کام لیا۔ چنانچہ 1917ء، 1918ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم بنی۔ اور دوسرا قدم 1929ء تک نہیں اٹھایا گیا اور جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس بلائی گئی تو اس کے کام کی تکمیل جاکر 1937ء میں ہوئی۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو سیاسی لوگوں کے دلوں میں انگریزوں کا بغض پیدا کرنے کا موجب ہوئیں۔ اگر انگریز وقت پر کام کرتے اور اپنی تجویز کے مطابق ہندوستانیوں کو ان کے حقوق دیتے چلے جاتے تو آج سیاسی لوگوں کے دلوں میں انگریزوں کا بغض پیدا نہ ہوتا۔ مگر اب ان کے دلوں میں یہ بغض اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اسے کسی طرح مٹایا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ ایسے وقت میں جبکہ جنگ کا خطرہ ہندوستان کے دروازوں تک پہنچ چکا ہے۔ ملک کی اکثریت کی نمائندہ کانگرس کا یہ فیصلہ کرنا کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں، بتاتا ہے کہ ان کے دلوں میں انگریزوں کا بغض اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ اب وہ اس بات کے لئے بھی تیار ہو گئے

ہیں کہ چاہے انہیں حکومت ملے یا نہ ملے، انگریز ضرور تباہ ہو جائیں۔ جب انسان مایوس ہو جاتا ہے تو اس کا دل غصے سے بھر جاتا ہے اور وہ کہتا ہے مَیں اگر مرتا ہوں تو بے شک مر جاؤں مگر میرے ساتھ میرا دشمن بھی مر جائے۔ ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ ایک کُبڑی عورت سے کسی نے پوچھا کہ کیا تیرا دل چاہتا ہے تیری کمر سیدھی ہو جائے۔ اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ وہ یہ کہتی کہ میرا دل چاہتا ہے میری کمر سیدھی ہو جائے، وہ کہنے لگی میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ باقی لوگ بھی میری طرح کُبڑے ہو جائیں۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تُو یہ کیوں کہتی ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ میرا کبڑا پن دور ہو جائے۔ اس نے جواب دیا کہ میرے کُبڑے پن کا کیا ہے۔ مَیں نے اپنی زندگی کے بہت دن گزار لئے اور جنہوں نے مجھ پر ہنسنا تھا، ہنس لیا۔ اب تو مَیں چاہتی ہوں کہ اَور لوگ بھی کُبڑے ہوں اور مَیں بھی ان کو دیکھ دیکھ کر ہنسوں۔

یہی حالت اس وقت ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی ہو گئی ہے۔ وہ مُنہ سے کہیں یا نہ کہیں اور در حقیقت سیاسی آدمیوں کا اعتبار بھی کوئی نہیں ہوتا۔ وہ مُنہ سے کچھ کہتے ہیں اور ان کے دل میں کچھ اَور ہوتا ہے۔ لیکن واقعات نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ دشمن ہندوستان کے دروازوں تک پہنچ چکا ہے ان کا یہ فیصلہ کرنا کہ جنگ میں انگریزوں کو کوئی مدد نہ دی جائے بلکہ انہیں ہندوستان سے نکال دیا جائے، بتاتا ہے کہ مایوس ہو جانے کے بعد وہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو دوسروں کے غلام تھے ہی، ہمارے لئے اب خوشی کا ایک ہی مقام ہے کہ انگریز بھی مریں اور دوسروں کے غلام بنیں۔ یہ ذہنیت کتنی خطرناک ہے بلکہ مذہبی نقطہ نگاہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بہت ہی گندی ذہنیت ہے۔ مذہب انسان کو یہی سکھاتا ہے اور اخلاق انسان سے اسی بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ جب کوئی مصیبت کا وقت آئے تو وہ پرانے گِلے بھول جائے مگر کتنے ہیں جو ایسے موقعوں پر پرانے شکوے بھول جاتے ہیں۔ بہت کم اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے اس مقام پر ہوتے ہیں کہ ایک لمبی شکایت کو صلح کے حصول کے لئے بھول جائیں۔ بیشتر حصہ لوگوں کا اَیسا ہی ہوتا ہے جو مُنہ سے صلح صلح پکارتا ہے مگر ان کا دل یہی چاہتا ہے کہ جیسے دوسروں نے ہم کو ستایا ہے اسی طرح ان کو ستایا جائے، جیسے انہوں نے ہم کو غلام بنایا ہے اسی طرح ان کو غلام بنایا جائے اور جیسے انہوں نے ہم کو مارا ہے اسی طرح ان کو مارا جائے۔

چاہے اس کے نتیجہ میں وہ خود بھی ہلاک اور برباد ہو جائیں۔ آخر جو لوگ اپنے دشمنوں کو قتل کرتے ہیں وہ یہ جانتے ہوئے ہی قتل کرتے ہیں کہ گورنمنٹ انہیں پھانسی دے دے گی مگر اس کے باوجود وہ اپنے فعل سے باز نہیں آتے کیونکہ وہ جانتے ہیں، گو ہم مر جائیں گے مگر مرنے سے پہلے ہم اپنا بدلہ لے لیں گے۔ یہ ذہنیت ممکن ہے کہ گاندھی جی کی نہ ہو، گو مَیں یہ خیال نہیں کر سکتا کہ نہ ہو۔ ممکن ہے یہ ذہنیت گاندھی جی کے قریبیوں کی نہ ہو گو مَیں خیال نہیں کر سکتا کہ نہ ہو کیونکہ انہوں نے فیصلہ ایسا کیا ہے جو اس نتیجہ پر ہر شخص کو پہنچنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن اگر گاندھی جی اور ان کے چند قریبیوں کی یہ ذہنیت نہ ہو تب بھی کانگرس کی اکثریت کی ذہنیت اس وقت یہی ہے کہ تیس سے چالیس کروڑ کی آبادی رکھنے والے ملک پر ایک چھوٹے سے ملک کے لوگوں نے جس کی آبادی چار کروڑ کے قریب ہے قبضہ کیا اور اس کی دولت، تجارت اور زراعت سے اس نے فائدہ اٹھایا۔ لوگوں نے تمام تکالیف کو برداشت کیا اور حکومت سے منتیں کیں کہ وہ انہیں حقوق دے۔ اس نے حقوق دینے کے متعلق کئی وعدے کئے مگر پھر ان کو پورا نہ کیا۔ وہ ایک لمبے عرصہ تک جو سو سال کے قریب ہے حکومت پر آس لگائے بیٹھے رہے اور انہوں نے سمجھا کہ ان کی امیدیں کسی دن بَر آئیں گی اور وہ بھی اپنی آنکھوں سے ہندوستان کو آزاد ممالک کی صف میں کھڑا ہوتا ہوُا دیکھیں گے۔ مگر وقت گزرتا چلا گیا اور حکومت نے اپنے وعدوں کو پورا کرنے کی طرف پوری توجہ نہ کی۔ آخر جب ان کی امید نا امیدی میں بدل گئی، ان کی خوشی رنج میں تبدیل ہو گئی، ان کے ولولے ان کے دلوں میں ہی رہے اور ان کی آرزوئیں پوری ہونے میں نہ آئیں اور انہوں نے دیکھا کہ انگریز اس وقت ایک سخت مصیبت میں مبتلا ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب ہماری خوشی اپنی حکومت میں نہیں بلکہ ہماری خوشی اپنے حاکم انگریزوں کو محکوم دیکھنے میں ہے۔ اس ذہنیت کے ماتحت کس طرح کوئی خیال کر سکتا ہے کہ آئندہ ہندوستان کی اکثریت والی قوم یعنی ہندوؤں اور انگریزوں میں کبھی صلح ہو سکتی ہے۔ مان لیا کہ انگریز سختی سے اس تحریک کو وقتی طور پر دبا سکتے ہیں مگر اس طرح قلوب کی آگ تو بجھ نہیں سکتی۔ آئر لینڈ میں بھی ایسا ہی ہوُا تھا۔ آئر لینڈ کتنا چھوٹا سا ملک ہے مگر وہاں کے لوگوں نے اپنے حقوق کے متعلق جد وجہد کی۔ جب ان کے

مطالبات کو نہ مانا گیا تو انہوں نے فساد کئے، بغاوتیں کیں اور چاہا کہ انہیں کسی طرح آزادی مل جائے مگر جب اس طرح بھی انہیں آزادی نہ ملی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انہیں آزادی ملی تو انہوں نے ساتھ ہی انگلستان سے علیحدہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ باوجود اس کے کہ آئرلینڈ کے دوست امریکہ نے زور دیا کہ وہ ایسا نہ کرے مگر پھر بھی انہوں نے انگلستان سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا۔ جو کچھ آئرلینڈ کے ڈی ویلرا نے وہاں کیا۔ تم یقیناً سمجھ لو کہ ہندوستان کا گاندھی بھی اس ملک میں وہی کچھ کرے گا۔ اس سے یہ امید کرنا کہ اتنی لمبی بحث اور لڑائی کے بعد وہ انگریزوں سے صلح کر لے گا، بہت بڑی نادانی ہے۔ گاندھی جی کے ساتھ سیاسی لحاظ سے ہمیں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے بہت بڑی قربانیاں کی ہیں اور ہندوستانیوں کو اٹھانے اور بیدار کرنے کے لئے انہوں نے جدوجہد سے کام لیا ہے۔ گو ان کا نقطۂ مرکزی ہندو قوم ہی ہے اور ہندو قوم کی اکثریت کو ہندوستان سمجھ لینا، گو ایک سیاسی غلطی ہے مگر ان کی قربانیوں کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا آدمی جس نے سوئے ہوئے تیس کروڑ آدمیوں کو جگایا، جس نے ان کے دلوں میں آزادی کی آگ لگا دی اور جس نے انہیں اپنے ملک کی آزادی کے لئے تیار کر دیا، جو ایسے وقت میں ملک کی خدمت کے لئے اٹھا جبکہ اس کی عمر باون سال کے قریب تھی اور جس نے اس غرض کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ ان تمام قربانیوں اور کوششوں کے بعد طبعی طور پر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ مَیں ہندوستان کو اپنی زندگی میں ہی آزاد دیکھوں گا اور مَیں اس خوشی سے مروں گا کہ مَیں نے اپنے ملک کو غلامی سے نکال کر حکومت کے بلند مقام تک پہنچا دیا مگر رفتہ رفتہ اس کی یہ امید مایوسی سے بدلنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ میری عمر ختم ہوتی جارہی ہے، میرا بڑھاپا بڑھتا جارہا ہے، میری سیدھی کمر خم ہونے لگی ہے، میرا اصاف دماغ پراگندگی کے آثار محسوس کرنے لگا ہے لیکن ہندوستان نے ابھی آزادی کی ہوا تک نہیں کھائی۔ تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ ایسے آدمی کی غصہ سے کیا کیفیت ہو گی۔ وہ اس آگ کو کتنا ہی دبائے، اس کے دماغ میں ہر وقت یہ شعلہ اٹھ رہا ہو گا کہ میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا، میری محنت اکارت چلی گئی اور میری جدوجہد نے کوئی پھل پیدا نہ کیا۔ مَیں مر جاؤں گا تو شاید

میری ان ساری قربانیوں کے بعد ہندوستان کی آزادی کا سہرا کسی ایسے لیڈر کے سَر بندھے گا جس نے میرے برابر تو کیا مجھ سے ہزاروں حصے کم بھی قربانیاں نہیں کی ہوں گی اور مَیں اپنے ملک کو غلام دیکھنے کی حالت میں ہی مٹی کے نیچے دفن ہو جاؤں گا یا آگ میں جل کر فنا ہو جاؤں گا۔ تم اگر ذرا بھی قوتِ فکریہ سے کام لو تو تم اس کی دماغی حالت کے سمجھنے میں کچھ نہ کچھ کامیاب ہو سکتے ہو۔ پس ایک انسان کمزور انسان جسے خدا کی مدد حاصل نہیں۔ گو وہ مُنہ سے کہتا ہے کہ مجھے اندرونی آواز سنائی دیتی ہے مگر درحقیقت وہ اس کے نفس کا دھوکا ہے۔ اسے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اس مایوسی کی حالت میں اس کے اندر کتنا غصہ پیدا ہوتا ہو گا اور اسے انگریزوں کے خلاف کتنا جوش آتا ہو گا۔ اب اس کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ جنگ کے بعد جب جرمنی اپنی جگہ چلا جائے گا اور جاپان اپنی جگہ۔ وہ انگریزوں سے صلح کر لے گا اور کہے گا آؤ ہم مل کر ایک حکومت قائم کر لیں۔ یہ ناممکن بات ہے۔ اب انگریزوں کے خلاف سیاسی ہندوستانیوں کے دلوں میں ایسا کینہ اور بغض پیدا ہو چکا ہے کہ جب بھی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ آئی، یہاں کی اکثریت انگریزوں کو ہندوستان سے الگ کرنے کی کوشش کرے گی۔

اِدھر مسلمانوں کی جو کیفیت ہے وہ بھی ویسی ہی دردناک ہے۔ مسلمانوں نے پہلے ہندوؤں کا ساتھ دیا اور گو خلافت مومنٹ کی گاندھی جی نے تائید کی لیکن درحقیقت انہوں نے خلافت مومنٹ کے پردہ میں ہندوستان کی آزادی کی بنیاد رکھ دی اور خلافت کی تحریک ان کے مقصد کو تقویت دینے والی بن گئی۔ اگر اس وقت ہندوستان میں خلافت کی تحریک جاری نہ ہوتی تو کانگرس کبھی اتنی مضبوط نہ ہوتی جتنی اس وقت مضبوط ہے۔ ممکن ہے وہ کسی قدر طاقت حاصل کر لیتی مگر موجودہ طاقت کا وہ سینکڑواں حصہ بھی نہ ہوتی۔ مسلمان بیشک نظام میں کمزور ہے مگر وہ سپاہی اچھا ہے۔ وہ اپنی ذات میں خود نظام قائم کرنے میں ڈھیلا ہے اس لئے کہ وہ خدا سے دور جا پڑا، اس کی تمام تر ترقی خدا تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے اور اس کے راستہ پر چلنے میں مرکوز ہے مگر چونکہ وہ خدا سے دور جا پڑا، اس لئے وہ ترقی سے بھی محروم ہو گیا۔ لیکن سپاہی آج بھی وہ اچھا ہے اور آج بھی مسلمان جان دینے میں دوسروں سے زیادہ دلیر ہے۔ بہرحال

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گاندھی جی کو مسلمانوں نے بڑا بنایا۔ اسی طرح اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مولوی محمد علی اور مولوی شوکت علی کو بھی گاندھی جی نے بنایا۔ گاندھی کا نظام کو قائم رکھنے والا ہاتھ اگر ان کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ اتنا کام نہ کر سکتے جتنا انہوں نے کیا۔ بہر حال ایسے شخص کی ہدایت کے ماتحت جو تنظیم کی قوت اپنے اندر رکھتا تھا، انہوں نے ہندوستان کو ابھارا اور مسلمانوں اور ہندوؤں میں وقتی طور پر ایسا اتحاد قائم ہو گیا کہ مسلمانوں نے سمجھا اب ہمیشہ کے لئے ان کا آپس میں بھائی چارا قائم ہو گیا ہے مگر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مسلمانوں نے دیکھا جس طرح پہلے رام چند دفاتر میں مسلمانوں کی ملازمت میں روک بنتا تھا، اسی طرح رام چند یہ پسند نہیں کرتا کہ عبدالرحمان کو کوئی ملازمت ملے۔ جس طرح پہلے دیوی دیال مسلمانوں کا ہاتھ کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ چھو جانے کی وجہ سے انہیں نجس اور ناپاک سمجھتا تھا اسی طرح آج بھی دیوی دیال یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی مسلمان اس کے کھانے پینے کی چیزوں کو ہاتھ لگائے بلکہ پہلے سے زیادہ اس کے دل میں مسلمانوں کی نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ تین چار سال تو انہوں نے تجربہ میں گزارے مگر پھر مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور ان میں بغاوت کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ لیڈروں نے ان کو روکنا چاہا مگر مسلمانوں کی بغاوت بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ ان کی اکثریت گاندھی جی سے الگ ہو گئی اور لیڈروں نے بھی محسوس کیا کہ اب ان کی صرف لیڈری ہی لیڈری رہ گئی ہے۔ مسلمان ان کے ساتھ نہیں رہے۔ تب انہوں نے بھی گاندھی جی کو چھوڑ دیا اور مسلمان پبلک سے آملے۔ اس کے بعد بار بار مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی مگر ہندوؤں نے ہر بار یہی کہا کہ پہلے ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ طے ہو جانا چاہئے۔ اس کے بعد تمہارے حقوق کا خیال رکھ لیا جائے گا۔ آخر جو کیفیت ہندوؤں کے دل کی انگریزوں سے سمجھوتہ نہ ہوتے دیکھ کر ہو گئی تھی وہی کیفیت مسلمانوں کے دل کی ہندوؤں سے سمجھوتہ نہ ہوتے دیکھ کر ہو گئی۔ چنانچہ ایک طرف اگر گاندھی جی نے ایک لمبے تجربہ کے بعد اعلان کر دیا کہ اب ہم انگریزی حکومت کے ماتحت نہیں رہ سکتے۔ ہم پہلے آزادی حاصل کریں گے اور پھر سوچیں گے کہ انگریزوں سے کیسے تعلقات رکھیں۔ تو دوسری طرف مسلم دنیا نے بھی یہ اعلان کر دیا کہ ہم ایک لمبے تجربہ کے بعد

اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہم ہندو اکثریت کے ماتحت نہیں رہ سکتے، ہم پہلے آزادی حاصل کریں گے اور پھر سوچیں گے کہ ہندوؤں کے ساتھ ہمارے کیسے تعلقات ہوں گے۔ گویا جو آواز گاندھی جی نے انگریزوں کے مقابلہ میں بلند کی وہی آواز مسلمانوں نے ہندوؤں کے مقابلہ میں بلند کر دی اور جو کیفیت تعلیم یافتہ ہندوؤں کے دلوں میں انگریزوں کے متعلق پیدا ہوئی تھی وہی کیفیت تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے متعلق پیدا ہو گئی۔

ان حالات میں جس وقت بھی جنگ ختم ہو گئی اندرونی فسادات پہلے سے بہت زیادہ ہوں گے کیونکہ چالیس کروڑ آبادی اور بیدار آبادی کو انگریز زیادہ دیر تک اپنے ماتحت نہیں رکھ سکتے۔ ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ انہیں ہندوستانیوں کو آزادی ضرور دینی پڑے گی۔ مگر اس کے بعد دو خطرناک لہریں اٹھیں گی جو ملک میں پھیل جائیں گی۔ ایک طرف ہندو اکثریت ہو گی جو برٹش ایمپائر سے اپنے آپ کو الگ کرنے کے درپے ہو گی اور دوسری طرف مسلمانوں کی چیخ ہو گی جو ہندو اکثریت کے مقابلہ میں بلند ہو گی۔ ان دو زبردست تحریکوں کے نتیجہ میں کوئی شخص یہ خیال بھی نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں امن قائم رہ سکتا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اس وقت دو فوجیں تیار ہو رہی ہیں۔ ایک فوج اپنے آپ کو برٹش ایمپائر سے نکالنے کے لئے کوشش کرے گی اور ایک فوج ہندو اکثریت کو اپنے اوپر غالب آنے سے روکے گی۔ پھر یہ دو فوجیں کسی دو علاقوں میں نہیں کہ انسان سمجھے مَیں کسی کونے میں جا بیٹھوں گا اور اس طرح امن میں رہوں گا بلکہ یہ فوجیں سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر گاؤں میں یہ دونوں فوجیں موجود ہیں، ہر قصبہ میں یہ دونوں فوجیں موجود ہیں، ہر شہر میں یہ دونوں فوجیں موجود ہیں، ہر ضلع میں یہ دونوں فوجیں موجود ہیں، ہر صوبہ میں یہ دونوں فوجیں موجود ہیں۔ اس لئے جس وقت یہ لڑائی چھڑے گی، یہ ایک صوبہ کی لڑائی نہیں ہو گی، یہ ایک ضلع کی لڑائی نہیں ہو گی، یہ ایک علاقہ کی لڑائی نہیں ہو گی بلکہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں اور گھر گھر کی لڑائی ہو گی۔ پس یہ مت خیال کرو کہ بد امنی کی موجودہ رَو کو دور کرنے کے لئے میری طرف سے جو اعلان کیا گیا تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ اعلان قائم ہے اور قائم رہے گا جب تک اس قسم کی تمام بد امنیوں اور فسادات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

علاوہ ازیں اس بات کو بھی یاد رکھو کہ موجودہ جنگ کے بعد ایک عظیم الشان خلا پیدا ہو جائے گا۔ ایسا خلا کہ اس سے پہلے ایسا خلا بہت کم پیدا ہوا ہے اور خدا تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ خلا کبھی قائم نہیں رہ سکتا بلکہ وہ ضرور پُر کیا جاتا ہے۔ پس وہ عظیم الشان خَلا جو ایشیا اور یورپ میں پیدا ہونے والا ہے اس کو کوئی نہ کوئی قوم ضرور پُر کرے گی اور درحقیقت وہی قوم دنیا کے مستقبل کی ذمہ دار قرار دی جاسکتی ہے جس قوم کو یہ توفیق مل جائے گی کہ وہ اس خَلا کو بھر دے۔ اسی قوم کو یہ توفیق بھی ملے گی کہ وہ آئندہ دنیا کی راہنما بنے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے لئے خدا تعالیٰ نے کیا مستقبل مقدر کیا ہوا ہے لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس خَلا کا مذہبی حصہ پُر کرنا خدا تعالیٰ نے ہمارے ذمہ رکھا ہوا ہے۔ مگر کیا تم سمجھتے ہو کہ خَلا دنیا میں آسانی سے پُر ہو جایا کرتے ہیں۔ کوئی خلا آسانی سے پُر نہیں ہوتا بلکہ وہی قوم خلا کو پُر کر سکتی ہے جو خون کی ندیوں میں سے چلتی ہوئی آئے۔ آج تک دنیا میں کبھی کسی قوم نے خلا پُر نہیں کیا جب تک پہلے وہ اپنی گردنوں کو کٹوانے کے لئے تیار نہیں ہوئی، جب تک وہ پہلے وطن سے بے وطن ہونے کے لئے تیار نہیں ہوئی، جب تک وہ پہلے اپنی جانوں کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی، جب تک وہ پہلے اپنی عزتوں کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کے اس خلا کو پورا کرنے کا وقت کب آئے گا مگر ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس خلا کا مذہبی حصہ پُر کرنا خدا تعالیٰ نے ہمارے ذمہ رکھا ہوا ہے۔ مَیں نے تمہیں بارہا سمجھایا ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ ہم چونکہ تبلیغی جماعت ہیں اس لئے کوئی دشمن ہماری گردنوں کو نہیں کاٹے گا۔ ایسا خیال کرنا اول درجہ کی نادانی اور حماقت ہے۔ مَیں نے بار بار تمہارے ذہنوں سے اس بات کو نکالا ہے مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ جب بھی کوئی ایسا ذکر آئے۔ ہماری جماعت کے بعض لوگ فوراً کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ ہم تبلیغ کرنے والے ہیں، لڑنے والے کہاں ہیں کہ ہماری گردنیں کاٹنے کے لئے قومیں آگے بڑھیں گی۔ مگر یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے۔ دنیا میں ہمیشہ مبلّغوں کی گردنیں کاٹی جاتی ہیں۔ مسیحیوں کی تین سو سال تک گردنیں کاٹی گئیں حالانکہ مسیحی جنگ سے جتنے متنفر تھے اتنے ہم نہیں۔ ہمیں تو اسلام وقت پر لڑائی کی اجازت دیتا ہے مگر مسیحیوں کو لڑائی کی کسی صورت میں اجازت نہیں تھی لیکن باوجود

اس کے ان کی گردنیں کاٹی گئیں اور سینکڑوں سال تک کاٹی گئیں۔ اسی طرح جب ہم بھی صحیح معنوں میں تبلیغ کریں گے تو دنیا اس بات پر مجبور ہو گی کہ ہماری گردنوں کو کاٹے۔ ابھی تک تو ہم نے تبلیغ کو اس رنگ میں جاری ہی نہیں کیا کہ ہماری جماعت کے آدمیوں کی گردنیں کاٹی جائیں۔ تمہارا مبلغ امریکہ میں گیا اور اسے وہاں کی حکومت نے نکال دیا۔ مگر تم نے کیا کیا؟ تم اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھ کر بیٹھ گئے۔ مگر جب حقیقی تبلیغ کا وقت آئے گا اُس وقت یہ طریق اختیار نہیں کیا جائے گا۔ فرض کرو تمہارا مبلغ امریکہ میں جاتا ہے اور اسے وہاں کی حکومت نکال دیتی ہے تو اس وقت یہ نہیں ہو گا کہ تم خاموشی سے گھروں میں بیٹھ رہو بلکہ تمہارا دوسرا مبلغ اس جگہ جائے گا۔ اس کو نکال دیا جائے گا تو تیسرا مبلغ جائے گا، اس کو نکال دیا جائے گا تو چوتھا مبلغ جائے گا۔ اسی طرح ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے اور تیسرے کے بعد چوتھے شخص کو وہاں جانا پڑے گا اور جب اس طرح بھی کوئی اثر نہیں ہو گا تو ہزاروں شخصوں سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوں اور خواہ انہیں بھوکا رہنا پڑے، خواہ پیاس کی تکلیف برداشت کرنی پڑے، خواہ پیدل سفر کرنا پڑے وہ جائیں اور اس ملک میں داخل ہو کر تبلیغ کریں۔ جس ملک میں داخل ہونے سے حکومت نے روک رکھا ہے۔ ایسی صورت میں کیا تم سمجھتے ہو امریکہ والے تمہیں قتل نہیں کریں گے۔ وہ ہر اس شخص کو جو اُن کے ہاتھ آئے گا قتل کریں گے اور کوشش کریں گے کہ ان کے ملک میں ہمارا کوئی مبلغ داخل نہ ہو لیکن اس کے باوجود جو مبلغ داخل ہونے میں کامیاب ہو جائے گا وہ ایسی شان کا مبلغ ہو گا کہ امریکہ کے لوگ خود بخود اس کی باتیں سننے پر مجبور ہوں گے۔ مگر اب تو یہ ہوتا ہے کہ سیکنڈ یا تھرڈ کلاس میں ایک شخص سفر کرتا ہوا جاتا ہے اسے ہر قسم کی سہولتیں میسر ہوتی ہیں اور وہ کسی غیر ملک میں جا کر تبلیغ کرنے لگ جاتا ہے۔ ایسا شخص مبلّغ نہیں سیّاح ہے۔ مبلغ قومیں وہی ہیں کہ جب حکومتیں انہیں اپنے ملک میں داخل ہونے سے روکتی ہیں تو وہ خاموش نہیں بیٹھ جاتیں بلکہ اپنی تجارت، اپنی زراعت، اپنی ملازمت اور اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نکل کھڑی ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر شخص یہ تہیہ کئے ہوئے ہوتا ہے کہ اب مَیں اس ملک میں داخل ہو کر رہوں گا اور تبلیغ کروں گا۔ ایسی صورت میں دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو

حکومت رستہ دے اور مبلّغوں کو اپنے ملک میں داخل ہونے دے یا انہیں داخل نہ ہونے دے اور ان سب کو اپنے حکم سے مروا ڈالے۔ اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جو قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اگر حکومت رستہ دے گی تو تم تبلیغ میں کامیاب ہو جاؤ گے اور اگر حکومت تمہیں مارے گی تو تم خون کی ندی میں بہہ کر اپنی منزل مقصود کو پہنچو گے۔

پس یہ مت خیال کرو کہ مبلّغوں کے لئے قربانیاں نہیں ہوتیں۔ وہ تبلیغ جو ملکوں کو ہلا دیتی ہے ابھی تک ہم نے شروع ہی نہیں کی۔ لیکن اب اس جنگ کے بعد غالباً زیادہ انتظار نہیں کیا جائے گا اَور تمہیں ان قربانیوں کے لئے اپنے گھروں سے باہر نکلنا پڑے گا مگر تم میں سے کتنے ہیں جو یہ قربانیاں کر سکتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ سلسلہ کا خزانہ ان سب کے اخراجات برداشت کرے گا اور اگر دو چار لاکھ آدمی ہماری جماعت میں سے نکل کھڑے ہوں تو سلسلہ کے خزانہ سے ان کو مدد دی جائے گی۔ سلسلہ کا خزانہ تو ان کے دسویں، سویں، ہزارویں بلکہ دس ہزارویں حصہ کو خالی روٹی بھی مہیا نہیں کر سکتا کُجا یہ کہ ان کے دوسرے اخراجات برداشت کرے۔ تب کیا ہو گا۔ یہی ہو گا کہ تمہیں کہا جائے گا تم کچکول[1] ہاتھ میں لے کر نکل کھڑے ہو اور فیصلہ کر لو کہ جب تک اس ملک کی تبلیغ کا راستہ نہیں کھلتا تم واپس نہیں آؤ گے۔

جو لوگ آج قربانیوں کے دعوے کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ کل اگر اُن سے اسی رنگ میں قربانیوں کا مطالبہ کیا گیا تو وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے نکل کھڑے ہوں گے۔ مَیں سمجھتا ہوں قربانیوں کا دعویٰ کرنا آسان ہوتا ہے اور شاید اگر موت کا سوال ہوتا تو ہم میں سے ہر شخص اپنی جان دینے کے لئے آگے آ جاتا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس بات کے لئے تیار ہیں کہ اگر انہیں سلسلہ کی طرف سے تبلیغ کے لئے غیر ممالک میں نکل جانے کا حکم ملے تو وہ گھر میں آئیں، سوٹی ہاتھ میں پکڑیں اور اپنی بیوی سے کہیں، یہ سب گھر کی چیزیں تمہارے پاس ہیں، تم چکّی پیسو اور اپنا اور اپنے بچوں کا گزارہ کرو، مَیں امریکہ یا جرمنی یا روس جا رہا ہوں کیونکہ وہاں کی حکومت نے ہمارے مبلغ کو نکال دیا ہے۔ اسی طرح ہر احمدی اپنے اپنے گھر کے دروازے بند کر کے اور سوٹی ہاتھ میں لے کر نکل کھڑا ہو اور اس کے دل میں ذرا بھی یہ احساس نہ ہو کہ اس کی بیوی اور بچوں کا کیا بنے گا اور وہ کس طرح گزارہ کریں گے۔ اگر یہ زمانہ آ جائے

تو تم خود ہی غور کر لو کہ تم میں سے کتنے ہیں جو اپنے نفس کو اس قسم کی قربانی پر تیار پاتے ہیں۔

تم مت سمجھو کہ یہ وقت دور ہے۔ اب وہ دن جن میں جماعت کو اس رنگ میں قربانیاں کرنی پڑیں گی، دور نہیں معلوم ہوتے بلکہ بہت ہی قریب آ پہنچے ہیں اور جنگ کے بعد کے قریب ترین عرصہ میں ہمیں ان قربانیوں کو پیش کرنا ہو گا۔ تیاری کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ کام کا وقت نزدیک آ گیا ہے۔ اس لئے یہ خیال اپنے ذہنوں میں سے نکال دو کہ ہم لڑنے والی قوم نہیں ہیں۔ تم خون کی ندیوں میں چلنے کے لئے تیار رہو۔ اپنی گردنیں دشمنوں کے ہاتھوں کٹوانے کے لئے آمادہ رہو اور اس بات کو سمجھ لو کہ اس قسم کی قربانیوں کے بغیر جماعتی ترقی ناممکن ہے۔ یہ خیال اپنے دلوں میں کبھی مت آنے دو کہ چونکہ تم امن سے رہتے ہو، فتنہ و فساد میں حصہ نہیں لیتے اس لئے دنیا تمہارا خون نہیں بہائے گی۔ با امن قوموں کو بھی دنیا میں مارا جاتا ہے اور ان پر بھی ایسا وقت آتا ہے جب انہیں کہا جاتا ہے کہ مرتے جاؤ اور بڑھتے جاؤ مگر میرے لئے ابھی جماعت کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اس میں سے ہر شخص اس رنگ میں قربانی کرنے کے لئے تیار ہو گا۔ ابھی چند دن کی بات ہے ہماری جماعت کے ایک دس سالہ بچے نے مجھے ایک خط لکھا جسے پڑھ کر مجھے حیرت بھی آئی اور خوشی بھی۔ اس نے اپنے خط میں لکھا کہ آپ ہمیشہ اپنے خطبات اور تقریروں میں جماعت کو قربانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں مگر ساتھ ہی کہتے ہیں کہ ابھی جماعت اس کے لئے پورے طور پر آمادہ نہیں ہوئی۔ آپ کا یہ خیال نوجوانوں کی نسبت صحیح نہیں۔ وقت آنے پر آپ کو معلوم ہو گا کہ جماعت کا ہر نوجوان اپنے آپ کو موت کے مُنہ میں ڈالنے کے لئے تیار ہے۔ مجھے اس بچے کا یہ خط پڑھ کر مزہ تو بہت آیا مگر مزہ ضرورت کو پورا نہیں کر دیا کرتا۔ جس قسم کی قربانیوں کی ہماری جماعت کو ضرورت ہے اور جس قسم کی قربانیوں سے کام لے کر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ان کا تو خیال کر کے بھی دل کانپ جاتا ہے۔ لرز اٹھتا ہے کہ نہ معلوم جماعت اس بوجھ کو اٹھا سکے گی یا نہیں۔ وہ لوگ جو ابھی نمازوں میں ہی سست ہیں، وہ لوگ جو ابھی اپنی زبان کو ہی گالیوں سے نہیں روک سکتے، وہ لوگ جو اپنے بھائیوں سے لڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں ان سے مَیں یہ کب امید کر سکتا ہوں کہ وقت آنے پر وہ دین کے لئے ہر قسم کی

قربانی کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ وہ اس بات کے لئے تو تیار ہوں گے کہ جب دس بیس آدمی ہماری جماعت میں سے اپنی جانیں قربان کرنے کا عہد کر کے گھروں سے نکل کھڑے ہوں تو وہ واہ وا اور شاباش کہنے لگ جائیں مگر یہ کہ وہ سارے ہی اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوں اور اس روک کو ہٹانے کے لئے تیار ہو جائیں جو تبلیغ کے راستہ میں واقع ہو اور جس کو ہٹائے بغیر صحیح طور پر تبلیغ نہ ہو سکتی ہو۔ اس کو ماننا ابھی میرے لئے مشکل ہے۔ ہاں مَیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جب وہ وقت آئے تو ہم میں سے ہر ایک کو خواہ مرد ہو یا عورت اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ وہ اپنی جان کو قربان کرنے کے لئے آگے نکل آئے تا کہ ہم اس کے انعام کو حاصل کرنے والے ہوں۔ اسے ناراض کر کے اپنی عاقبت تباہ کرنے والے نہ ہوں۔ اگر ہماری جماعت کا ہر فرد اس رنگ میں قربانی کرنے کے لئے تیار ہو جائے تو فتح اور کامیابی کا دن ہمارے لئے جلد سے جلد آ سکتا ہے۔ ورنہ اس دن کا خوشنما منظر ہمارے سامنے نہیں آ سکتا۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ وقت کب آئے گا اور اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ آواز میری زبان سے بلند ہو گی یا کسی اَور شخص کی زبان سے مگر مَیں یہ تمہیں صاف صاف اور واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس دن تک یہ آواز بلند نہیں ہو گی اور جس دن تک ہماری جماعت اس آواز پر لبیک نہیں کہے گی صرف زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے، اُس وقت تک احمدیت کی ترقی کا دن نہیں چڑھ سکتا اور کبھی نہیں چڑھ سکتا۔" (الفضل 5 ستمبر 1942ء)

1: کچکول: کشکول (فیروز اللغات)